© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

اقتصادیات میں اسلام کا موقف

(۲)

کیا اجتماعی ملکیت کا تصور غیر فطری ہے؟

برژوائی حکما نے اجتماعی ملکیت کے خلاف ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ یہ سراسر غیر فطری جذبہ ہے کیونکہ نجی ملکیت کا تصور نہ صرف انسانی فطرت کا جزو لاینفک ہے بلکہ یہی وہ اصول ہے جو انسان کو کام پر اُبھارتا اور آمادہ کرتا ہے۔ اور اگر زمین، کارخانہ اور پیداوار سے یہ تعلق قائم نہیں رہتا اور انسان یہ نہیں سمجھتا کہ یہ چیزیں میری ہیں تو اس صورت میں ناممکن ہے کہ کوئی شخص دلجمی، اطمینان اور اخلاص کے ساتھ اپنے فرائض کار انجام دے سکے۔ اس اعتراض میں بڑا وزن ہے۔ صدیوں کے تعامل سے نجی ملکیت کے مسئلہ نے اس طرح دلوں میں گھر کر لیا ہے کہ جہاں تک مجرد قیاس آرائی کا تعلق ہے، یہ بات واقعی محال معلوم ہوتی ہے کہ انسان ذاتی منفعت سے دامن کشاں ہو کر بھی اجتماعی ملکیت کے نظریہ کو اپنا سکتا ہے اور اسی دلجمعی، اخلاص کے ساتھ اپنے فرائض کار انجام دے سکتا ہے۔ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف ایسا ہونا ممکن ہے بلکہ عملاً ایسا ہو رہا ہے اور اس اصول پر مبنی معاشرہ چین، روس اور مشرقی یورپ میں پھل پھول رہا ہے۔ اول اول مغرب کے حکما نے اس خیال کو محض مجذوب کی بڑ اور شاعری "یوٹوپیا" UTOPIA قرار دیا تھا اور پیشین گوئی کی تھی کہ یہ شاعری زیادہ دیر چلنے والی نہیں۔ لیکن تاریخ نے بتا دیا کہ تجربہ کی یہ نوعیت بھی کامیابی سے ہمکنار ہے اور ایک بالکل ہی نئی تہذیب کا پیش خیمہ بھی ہے۔ رہا فطرتِ انسانی کی دلچسپی کا سوال تو اشتراکیت کے حامی اس کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے تصورات کو ماضی میں معاشرہ کی ایک خاص ترتیب نے جنم دیا تھا اور جب ترتیب اشیا کا یہ شیرازہ ہی اشتراکیت کی وجہ سے بکھر گیا تو ان تصورات کے قائم رہنے کی کیا وجہ جواز ہے، جو اس ترتیب خاص کے نتیجے میں ابھرے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے نقطۂ نگاہ سے خود فطرت کو بھی تو بدلا جا سکتا ہے۔ تہذیب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تمدن کی یہ ہماہمی اور فروغ دار تقا آخر اس کے سوا کیا ہے کہ انسان نے فطرت کے جبر کے خلاف مسلسل تگ و دو کی ہے۔ اس پر قابو پایا ہے، اسے سنوارا اور بدلا ہے اور اس لائق ٹھہرایا ہے کہ انسان اس معمورۂ ارض پر خوشگوار زندگی بسر کر سکے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے اس تجزیہ سے اتنا تو ہوا کہ آغاز بحث میں ہم نے انسانی اشکال کی جو تصویر کھینچی تھی اور اس کا جو حل تجویز کیا تھا، اس کا کسی حد تک اثبات ہو گیا۔ یہ بات بہرحال نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آگئی کہ ہم اگر کسی اقتصادی نظام کو مشروط طور پر قبول کر سکتے ہیں تو وہ سرمایہ دارانہ نظام تو یقیناً نہیں ہو سکتا۔ اشتراکیت کی اقتصادی روح البتہ ایسی شئی ہے جس کو ہم اپنے شرائط پر اپنے فلسفۂ حیات میں سمو سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کو مسترد کر دینے کی وجہ ظاہر ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ذاتی ملکیت کے تحفظ کی ذمہ داری تو قبول کرتا ہے، مگر عادلانہ تقسیم دولت کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کرتا اور ان اشکالات کو حل نہیں کرتا جو صنعتی انقلاب نے ابھار دی ہیں۔ اقتصادی روح کو اپنا لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کے اس فلسفہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ ذرائع پیداوار پر عموماً فرد یا بعض افراد کے قبضہ کے بجائے پوری ملت کو قابض ہونا چاہیے اور یہ کہ سرمایہ کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت خرچ کرنا چاہیے۔ منصوبہ بندی میں مصالح ملی کو بہرحال تقدم حاصل ہوگا۔ اور بغیر کسی گروہ، خاندان اور اجارہ داری کا لحاظ کیے دیکھا یہ جائے گا کہ ملت کی کون ضروریات زیادہ اہمیت کی حامل ہیں اور کون کم درجہ اعتنا چاہتی ہیں خصوصیت سے اس کے مقاصد میں یہ بات شامل ہوگی کہ وہ محنت کش طبقہ جو تہذیب و تمدن کی آسائشوں کو جنم دیتا ہے نہ صرف ان آسائشوں سے محروم نہ رہے بلکہ ہیئت حاکمہ میں ہر ہر سطح پر شریک رہے تاکہ یہ اپنے حقوق کی اچھی طرح حفاظت کر سکے اور معاشرہ کو انقلاب کی راہوں پر ڈال سکے ——— اور اس روح کو اسلامی قالب میں، اسلامی عقائد اور اسلامی فقہ میں بلکہ اسلامی فکر و استدلال میں اس طرح مجتہدانہ اسلوب سے ڈھالنا ہوگا کہ یہ چیز اپنے نتائج اور شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل اسلامی ہو جائے۔

اور اس اقتصادی روح کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا عمل کچھ دشوار نہیں۔ ماضی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ہم نے یونانی فلسفہ، فکر اور انداز استدلال کو اس طرح بدلا ہے۔ اور اس طرح فقہ، اصول اور تشریح و تفسیر عقائد میں اس سے کام لیا ہے کہ کوئی بھی شخص اس کو یونانیت سے تعبیر نہیں کر سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح غیر واضح ہے

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح ہمارے نزدیک غیر واضح ہے۔ ہمیں سوشلزم سے صرف اس کے معاشی نظام کی حد تک دلچسپی ہے۔ اس کے پورے فلسفہ وفکر سے نہیں، اس لیے کہ سوشلزم اپنے ریاضیاتی مزاج کے اعتبار سے نہ اسلامی ہے نہ غیر اسلامی، یہ ایک سائنس ہے جس کا تعلق تقسیم دولت کے ایک خاص طریق سے ہے۔ اس کی بنیاد و اساس میں جدلی مادیت کا تصور کارفرما ہے۔ اور اس کے بارہ میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کو مان لینے کے معنی عقیدہ و ایمان کی تابش و ضیا سے قطعی محرومی کے ہیں۔ اور کوئی مسلمان بھی اس محرومی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے حقیقۃ الحقائق اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہے، مادہ اس کا پھیلاؤ، انتشار اور تخلیق و اختراع کی مختلف صورتیں، اس کی صفتِ تکوین کی جلوہ گری ہیں۔ اور وہی انسانی فلاح وبہبود کا پاسبان بھی ہے۔ ہمیں رشد و ہدایت کے لیے جہاں زمین پر بکھیرے ہوئے شواہد و آیات سے استفادہ کرنا ہے، وہاں آسمان کی طرف بھی دیکھنا ہے۔ وحی و جبریل کی صدائے دلنواز کو بھی آویزۂ گوش بنانا ہے۔ عقل و دانش بلاشبہ درخورِ اعتنا ہے، اور اسلام سے بڑھ کر اس بات کا کون حامی ہوگا کہ انسان غور و فکر سے کام لے، سوچے سمجھے، اور دین اور دنیا دونوں کے معاملہ میں خرد و تعقل اور برہان و دلیل کی روشنی میں قدم بڑھائے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دین اور خرد کے تقاضوں میں کوئی تضاد رونما نہیں۔ اگر ایک شی عقل و تجربے کی میزان میں پوری اترتی ہے تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد، خود اسلام اس کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک حقیقت کتاب و سنت کے احکام سے ثابت ہے تو عقل و دانش کے عین مطابق ہے۔ ان دونوں میں تضاد اس وقت ابھریگا جب کوئی حقیقت یا عقل و تجربے کی کسوٹی پر پوری نہیں اترے گی، اور یا دینی معیار اور پیمانوں کے اعتبار سے دین نہیں قرار پائے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ عقلِ صحیح اور دینِ صحیح میں ان بن ہو۔ یعنی جب کسی شی کا دین ہونا ثابت ہو جائے، یا جب کوئی شی سائنسی حقیقت بن جائے تو دونوں میں ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ عقل و خرد اور وحی دونوں اللہ کی دین اور بخشش ہیں۔ اور دونوں کے شانہ بشانہ چلنے ہی سے تہذیب و تمدن کے تقاضے فروغ پاتے اور پنپتے ہیں۔ فکر و دستور کو اپنائے بغیر تہذیب زندگی کی پھبن سے محروم رہتی ہے۔ اور دین کو اختیار کیے بغیر زندگی کا کوئی نقشہ نہ بن سکے گا، ادھورا رہے گا۔ اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکیزگی، استواری، اور گہرائی نام کو نہیں پائی جائے گی۔ یہ صحیح ہے زندگی کے ایسے چلن میں خواہشات وجذبات کی تسکین کا سامان ضرور فراہم ہو گا، مگر روح کی پرواز کا کوئی اہتمام نہ ہو سکے گا۔ یعنی انسان میں جو ایک ملکوتی عنصر ہے یا اللہ کی طرف بڑھنے اور اس کو پلنے کا لطیف داعیہ اور تقاضا اس کی فطرت میں مضمر ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

دین عقل و دانش کے درجۂ استناد کو ہرگز متاثر نہیں کرتا۔ صرف اس کی حدودِ اختیار کی تعیین کرتا ہے۔ اور زیادہ تر ان مقامات واحوال کی تشریح کرتا ہے، جن کی سرحدیں عقل و دانش کے تقاضوں سے آگے ہیں۔ جہاں فکر و استدلال کی شعبدہ طرازیوں کو آگاہی نہیں ہو سکتی۔ جہاں ارسطو، افلاطون اور سقراط کے شہپر مفلوج ہو جاتے ہیں اور تجربہ وانکشاف کی واماندگیاں روشنی عطا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ یہ غلط ہے کہ دین کو مان لینے سے فکر و استدلال کی قوتیں ماند پڑ جاتی ہیں، اور انسان طرح طرح کے تعصبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ دین کے بارہ میں یہ سوءِ ظن دراصل قرونِ وسطیٰ کی اس کشمکش سے پیدا ہوا جو کلیسا اور عقل میں تھی اور جس نے تین صدیوں تک پوری مغربی دنیا کو الجھائے رکھا۔ ورنہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ تو توحید کا علمبردار ہے اس لیے عقل و دین کے اس اختلاف اور دوئی کو دور کرنے آیا ہے جس نے دونوں میں نزاع وآویزش کی طرح ڈالی اور صدیوں قوموں کو حرب وپیکار میں الجھائے رکھا۔ ہم یہ نہیں مانتے کہ دین کو معاشی واجتماعی حالات پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دین کا تعلق اللہ تعالیٰ کے فیضانِ ربوبیت سے ہے۔ اس نے جب انسان کو پیدا کیا ہے، اس کی غذا اور لباس کا اہتمام کیا ہے اور اس کی جسمانی تقاضوں کی تکمیل فرمائی ہے تو اس کے ساتھ اس نے اس کی روح کی بالیدگی کے اسباب بھی فراہم کیے ہیں۔ ہم تاریخ کی جبریت کے قائل نہیں۔ ہم انسان کو، انسانی فکر اور اس کی مجتہدانہ کوششوں کو تاریخ ساز عنصر قرار دیتے ہیں۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے کہ تاریخ ارتقا کے بعض خطوط اس طرح متعین کر دیتی ہے کہ جن سے انحراف ناممکن ہوتا ہے لیکن یہ خطوطِ ارتقا خود انسان ہی کی کد و کاوش سے ابھرتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اس دور میں سرمایہ داری نظام کی کہنگی کو حیاتِ تازہ نہیں بخشی جا سکتی لیکن اس دور کی مادیت کو قطعی بدلا جا سکتا ہے۔ اس وقت معاشرہ کو ابن عربی، ابن تیمیہ، اور ابوحنیفہ ایسی بھاری بھرکم شخصیتوں کی ضرورت ہے جو مادیت کے طوق وسلاسل سے انسان کو نجات دلائیں، جو کتاب وسنت کے دبستان سے [illegible] تفسیر و فقہ کا ایسا سلجھا ہوا ڈھانچہ تیار کریں جو نہ صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کے لیے بلکہ پوری دنیا سے انسانیت کے لیے قابلِ قبول ہو۔

عدل و مساوات کی اس اقتصادی روح کو ہم نہ صرف اسلامی روح سمجھتے ہیں بلکہ اس دور میں انسانیت کا فائق تر تقاضا قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر کسی نظام سے انسان اور انسان میں فرق و امتیاز کے حدود مٹتے ہیں، ظلم و تعدی کی راہیں مسدود ہوتی ہیں اور انسانی برادری بڑی حد تک زندگی کی نشاط کاریوں میں ایک ہی سطح پر فائز ہوتی ہے، تو اسلام اور انسانیت کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

نجی ملکیت اور اسلامی فقہ

اشتراکیت کی یہ اقتصادی روح جس کو ہم اسلامی فکر میں سمو لینا چاہتے ہیں، چونکہ اجتماعی ملکیت کے نظریہ کی حامی ہے، اس بنا پر نجی ملکیت کے مسئلہ پر فقہی سطح پر اس لیے غور کر لینا ضروری ہے کہ اس میں تقسیمِ دولت کے قریب قریب تمام ابواب یعنی حضانت، وراثت، زکوٰۃ، صدقات وغیرہ کو اسی مسلمہ روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ دولت اور اس کے ذرائع پر، مالک ایک فرد یا کچھ لوگ ہیں۔ اور مسائل کے اس انداز اور ترتیب سے قدرتاً اس شبہ نے یقین کی صورت اختیار کر لی ہے کہ اسلام اور اجتماعی ملکیت دو مختلف چیزیں ہیں، حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں۔

اس بارہ میں اسلامی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند نکات پر سنجیدگی سے غور کر لیا جائے:

۱۔ اس سلسلہ کا پہلا سوال یہ ہے کہ خود فقہ اور اس کے مسائل و احکام کی حیثیت کیا ہے۔ کیا اس کے معنی قاعدہ و قانون اور تفصیلات کی لفظی و ظاہری ابدیت کے ہیں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ان مجتہدانہ کوششوں سے تعبیر ہے جن کو ہر ہر دور میں پیش آئند مسائل کے حل و کشود کی غرض سے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ فقہ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ فن ہر ہر دور میں اجتہاد و فکر کی تازہ کاریوں کا آئینہ رہا ہے اور اس میں کبھی بھی جمود اور ٹھہراؤ کو مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ جن لوگوں نے فقہ، تاریخ، تدوینِ فقہ کا ارتقائی مطالعہ کیا ہے وہ اس چیز کو جانتے ہیں کہ اس کا تعلق الفاظ و حروف سے کہیں زیادہ معانی مناطِ حکم اور تعلیل سے ہے۔ یعنی ہر ہر فیصلہ و حکم میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ اس کی تہ میں کیا معنی، کیا روح، اور کیا تعلیل کارفرما ہے۔ فروع و مسائل کا تخرج انہی چیزوں کی روشنی میں عمل میں آتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ کسی فقہی ترتیب میں احکام و مسائل کی نوعیت کو سمجھنے اور تعلیل مناط حکم کو متعین کرنے کے لیے اجتہاد کی دو سطحیں ہیں۔ عام حالات میں تو صرف یہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ سے متعلق نصوص کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے۔ صحابہ کا تعامل دیکھا جائے، یا نحو و پیرایہ بیان کے تقاضوں اور اصولِ فقہ کے مقررہ پیمانوں کی روشنی میں یہ طے کیا جائے کہ شریعت کا کیا مقصد ہے۔ اور جب اس کی تعیین ہو جائے کہ اس میں فلاں مصلحت علت یا مناط حکم کی حیثیت رکھتی ہے تو فروع کو اس کے مطابق ترتیب دیا جائے۔

غیر معمولی حالات میں اسلوب اجتہاد اس سے قطعی مختلف ہوگا۔ یعنی جب صورتِ مسئلہ یوں ہے کہ ایک اصول یا طریقِ عمل، اسلامی روح سے ہٹ جائے اور نص و صورت میں واضح تضاد ابھر آئے تو ایسے حالات میں اجتہاد فکر و تدبر کے تقاضے یہ ہو جائیں گے کہ اسلام کی اس مسئلہ خاص میں اصل روح، اس کی حقیقی مصلحتیں اور ابدی غرض و غایت دریافت کی جائے اور اس شی کے لیے ہمیں قرآن و سنت کا مطالعہ گہرے فلسفیانہ انداز میں کرنا ہوگا۔

تاریخ کی پیدا کردہ برائیوں کے متعلق اسلام کا موقف

ہمیں مسائل اور ترتیب احکام کو اس نقطہ نظر سے جانچنا ہوگا کہ ان کا تاریخی پس منظر کیا ہے یعنی اس دَور کی اجتماعی مجبوریاں کس حد تک اس مسئلہ کو متاثر کرتی ہیں اور جب یہ مجبوریاں باقی نہ رہیں تو پھر صورتِ مسئلہ کیا ہوگی۔ وضاحت کے لیے ہم غلامی کے مسئلہ کو پیش کریں گے۔ اسلام سے بہت پہلے جاگیردارانہ اور قبیلوی معاشرہ نے اسے رواج دیا، اور پھر یہ بیماری معاشرہ میں اس طرح رچ بس گئی کہ پرانی ثقافت کا جزو لاینفک قرار پائی۔ یونان، روم، ایران اور عرب اقوام میں غلامی ایک ضرورت تھی۔ یہ لوگ محنت و کاوش سے مختلف ہنر سیکھنے، کھیتی باڑی کا مشغلہ اختیار کرتے اور کاروبار کے سلسلہ میں دور دراز علاقوں میں اپنے آقاؤں کی نگرانی میں روپیہ کماتے، اور آقاؤں کی جھولی میں ڈال دیتے۔ پہلے پہل مخالف قوم یا قبیلہ کے قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ غالب اقوام و قبائل نے کمزور مخالفین کو بجبر غلام بنانا شروع کر دیا۔ اور پھر جب یہ انداز چل نکلا تو عرب، روم اور یونان کے بازاروں میں کھلے بندوں غلام بکنے لگے اور یہ بات شرافت کے لوازم میں شمار ہونے لگی کہ امرا کے ہاں کثرت سے لونڈی غلام ہوں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں آسودہ حال لوگوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک طبقہ پیدا ہوا اور پھر ان آسودہ حال لوگوں کو تہذیب و ثقافت کی گتھیوں کو سلجھانے اور علوم و فنون یا فلسفہ و حکمت کے عقدوں کے حل کرنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ صدیوں کے تعامل سے غلامی اس طرح دنیا کی قوموں میں مقبول ہوئی کہ دلوں میں اس کے بارہ میں یہ احساس ہی اُٹھ گیا کہ یہ بھی کوئی برائی یا انسانیت کی جبین پر بدنما داغ ہے۔ چنانچہ ارسطو جب انسانوں کی تقسیم کرتا ہے تو بغیر ضمیر کی خلش محسوس کیے بلا محابا کہہ دیتا ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ شرفا اور غلام - اسلام جب عدل، مساوات اور توقیر آدمیت کے پیغام کو لے کر آیا اس وقت ساری مہذب دنیا میں غلامی کا چلن تھا اور دنیا کی معیشت و اقتصادیات کا زیادہ تر دار و مدار اس بات پر تھا کہ غلاموں کے اس گروہ کو باقی رکھا جائے، ان کی آپس کی لڑائیاں اور کاروبار کی بوقلموں صورتیں اس بات کی متقاضی تھیں کہ اس نظام کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے۔ پھر چونکہ یہ بیماری عالمگیر تھی، اس لیے ناممکن تھا کہ کوئی نظامِ اخلاق یک طرفہ فیصلہ کر کے اس کو حرام ٹھہرا دے۔ تا آنکہ تمام قوموں کا ضمیر آپ سے آپ جاگ اُٹھے، اور شرفا ان تمام اقتصادی ذمہ داریوں کو خود نبھانے کا عہد کریں جو انھوں نے غلاموں کے سپرد کر رکھی تھیں - یہ برائی اس وقت کے حالات کی ایک خاص ترتیب اور نہج نے پیدا کی تھی اور یہ اسی وقت ختم ہو سکتی تھی جب ترتیبِ اشیا کی یہ صورت قائم نہ رہے۔ چنانچہ جب صنعتی انقلاب نے کروٹ لی اور دنیا کا اقتصادی اور معاشی ڈھانچہ بدلا تو کسی مذہبی وعظ، دینی فتوے اور کوششوں کے بغیر ساری دنیا میں اس کا استیصال ہو گیا۔ ان حالات میں اسلام کے سامنے حکیمانہ راہ یہی تھی کہ غلامی کے اس نظام کے جواز و عدم کی بحث کو چھیڑے بغیر ان کے حقوق کو اس طرح متعین کر دے، لوگوں کے دلوں میں توقیرِ آدمیت کے نقش کو اس طرح بٹھا دے، اور خشیت و خوفِ الٰہی کی نعمت سے اس طرح معاشرہ کو مالا مال کر دے کہ جس سے ظلم اور زیادتی کے امکانات یکسر ختم ہو جائیں - اور اس پس ماندہ مخلوق کو بھی پہلی دفعہ اُبھرنے، ترقی کرنے اور شرف و فضیلت سے بہرہ مند ہونے کے مواقع ملیں۔ چنانچہ اسلام نے اصلاح کی یہی راہ اختیار کی۔ غلامی کو اگرچہ اس نے چیلنج نہیں کیا تاہم غلاموں کے حقوق کی وضاحت کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ تم ان کو وہی کھلاؤ پلاؤ جو خود کھاتے پیتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو - ان کی آزادی کو نہ صرف بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ بلکہ عملاً ایسی صورت پیدا کی کہ ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد قیدِ غلامی سے رہائی حاصل کر سکے۔ اور تاریخ شاہد ہے، اسلام کے اس طرزِ فکر نے غلاموں کے سر پر نہ صرف تاجِ شاہی رکھا، بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدیث، فقہ، تفسیر کے میدانوں میں بھی ان کو ایک خاص مقام عطا کیا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ صدیوں مسلمانوں میں یہ برائی رائج رہی اور کتاب وسنت کی نصوص اور فقہ وتفسیر میں ان کے بارہ میں احکام ومسائل کی جو ترتیب ہے، اس سے اس کی حرمت وممانعت ثابت نہیں ہوتی بلکہ بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید اسلام نے اس کو سرے سے کوئی برائی ہی تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ کہ اس دور کے ایک روشن ضمیر مگر معذرت پسند (   ) متکلم نے آج بھی اس کو بعض حالات میں جائز ٹھہرایا ہے۔ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر حکیمانہ غور کیا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ اسلام اس کو بہت بڑی اجتماعی بُرائی سمجھتا ہے کیونکہ اگر یہ برائی نہ تھی تو اس نے آخر غلاموں کے درجہ کو بلند کرنے کی کیوں کوشش کی، کیوں ان کی آزادی کو بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

فلا اقتحم العقبة ۝ وما ادراك ما العقبة ۝ فك رقبة ۝ (بلد: ۱۲)

تو کیوں نہ انسان اس گھاٹی میں کود پڑا۔ تمہیں کیا معلوم وہ گھاٹی کون ہے؟ کسی انسان کی گردن سے غلامی کا جُوا اتار پھینکنا۔

کیوں نذور اور کفارات کی شکل میں ان کو آزادی کے مواقع بخشے، کیوں زکوٰۃ کا ایک مصرف یہ ٹھہرایا کہ غلاموں کو آزاد کرایا جائے، اور کیوں ان کو مکاتبت کا یہ فقہی حق عطا کیا کہ مالک کو طے شدہ رقم دے دینے کے بعد یہ آزاد ہوسکتے ہیں۔ فقہ وحدیث کی کتابوں میں ان سے متعلقہ ترتیب مسائل سے یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ اسلام اس برائی کو جائز تصور کرتا ہے۔ اس لیے کہ اگر غلامی فی نفسہٖ بُرائی اور انسانیت کی بہت بڑی توہین ہے تو اسلام جو انسانیت اور فطرت کا دین ہے کبھی بھی اس کو جائز قرار نہیں دے سکتا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت کی بین الاقوامی مجبوریوں کی خاطر وہ یک طرفہ قدم نہ اٹھائے جس کا جواب دوسری طرف سے نہ دیا جاسکے اور اس وقت کا انتظار کرے جب انسانیت تاریخ کے ایک ایسے دور میں داخل ہو جب غلاموں کی جگہ مشینیں سنبھال لیں اور اس وجہ سے غلاموں کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اسلام ایک حکیمانہ اور عملی مذہب ہے، وہ مسائل واحکام کے متعلق ایسی تجرید (   ) کا قائل نہیں جو بے اثر ہو۔ اس لیے اس نے اگر غلامی کو کھلے بندوں حرام قرار نہیں دیا۔ تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس نے اس کو برائی قرار دے کر اس سے پیدا شدہ مضرتوں کی اصلاح نہیں کی۔ اگر علاج کی ضرورت اس وقت ابھرتی ہے جب بیماری پیدا ہو تو اصلاح احوال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی نوبت بھی اُسی وقت آتی ہے، جب معاشرہ میں کوئی فساد، بگاڑ یا برائی حقیقتاً رونما ہو۔ اس بنا پر اہل مغرب کے اس اعتراض کو ہم صحیح نہیں سمجھتے کہ اسلام نے غلامی کے ساتھ مفاہمت کرلی اور اسے جائز قرار دے کر احکام و مسائل کی تلقین کی۔

اگر مسائل کے حل و کشود کے سلسلہ میں ہمارے معروضات صحیح ہیں اور ہمارا نقطۂ نظر صحت و صواب کے پہلوؤں کو بڑی حد تک اجاگر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو آئیے ان کی روشنی میں نجی ملکیت کے مسئلہ پر غور کریں۔

نجی ملکیت کا مسئلہ

نجی ملکیت کا مسئلہ بھی ایک فرق کے ساتھ غلامی کی طرح ہے۔ فرق یہ ہے کہ جہاں غلامی فی نفسہٖ بُری شئی ہے وہاں نجی ملکیت فی نفسہٖ برائی نہیں بلکہ ایک خاص مرحلے میں بُرائی ہے۔ اسلام نے بہرحال اس اصول کی تخلیق نہیں کی، بلکہ یہ جاگیردارانہ عہد کا ورثہ ہے جس سے دین کو دوچار ہونا پڑا۔ اس کی تہ میں جو فلسفہ کارفرما ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر شخص جن چیزوں کا جائز طور سے وارث ہے اور مال و دولت کی جس مقدار کو اس نے اپنی محنت و کاوش یا کاروباری مہارت سے جمع کیا ہے اس کا تحفظ کیا جائے اور کوئی بھی شخص زور، دھاندلی اور مکاری سے ان حقوق میں دخل انداز نہ کرسکے۔ نجی ملکیت کے معنی اصول تحفظ حقوق کے ہیں۔ یعنی ہر شخص اس اطمینان سے بہرہ مند ہو کہ معاشرہ میں اس نے اپنی فکری و عملی صلاحیتوں کے بل بوتے پر جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اس کا اپنا ہے۔ غیروں کو اس میں سلب و نہب کا حق نہیں۔ اس حد تک ملکیت کا مسئلہ بلاشبہ معقول اور درست ہے۔ اس میں تناقض اس وقت ابھرتا ہے جب ذاتی ملکیت کا دائرہ پھیل کر دوسروں کے حقوق پر اثر انداز ہو۔ جب ایک شخص کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ روپے کی بدولت بیسیوں یا سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں کی محنت و عرق ریزی کا استحصال کرسکے جب یہ معاملہ ایک شخص سے آگے بڑھ کر ایک ایسے استحصالی نظام کی شکل اختیار کرلے جس میں معاشرہ اگرچہ بظاہر ایک ہی نظر آئے تاہم اس میں نمایاں طور سے دو تہذیبیں، دو طبقے اور دو طرح کے مفادات ابھر آئیں۔ جس میں انسان اور انسان میں فرق و امتیاز کی دیواریں اتنی بلند ہو جائیں کہ حق و انصاف اور شرف انسانی [illegible] پہنچ سکے۔ اور جب یہ نظام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظلم وزیادتی کی اُن حدود کو چھونا شروع کردے جہاں انسانوں کا ایک جم غفیر بنیادی ضروریات تک سے محروم ہوجائے۔

سوال یہ ہے کہ جب تضاد کی یہ صورت پیدا ہوجائے، جیساکہ صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہوگئی ہے تو اس وقت نجی ملکیت کے تصور کو اسلامی فقہ کی روشنی میں بدلنا ضروری ہوگا یا نہیں۔ ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ اسلامی فقہ ہرگز جامد نہیں ہے۔ اس میں قیاس واجتہاد کی ہمیشہ گنجائش رہی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ جب کوئی فقہی صورت اپنے اصولوں سے ہٹ جائے اور صورت فقہی اور مقاصد و اغراض میں تضاد پیدا ہوجائے تو اس وقت ضروری ہوجاتا ہے کہ اسلام کی وسیع تر تعلیمات اور پیمانوں پر غور کیا جائے اور ان کی روشنی میں مجتہدانہ قدم اٹھایا جائے۔ یوں بھی فقہ اسلامی میں مصالح مرسلہ کی اصطلاح موجود ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ مسائل ایسے ہیں جن سے اسلام نے براہِ راست تعرض نہیں کیا اور ان کو اس وقت تک کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے جب تک زمانہ ان کی ضرورت کا احساس نہیں دلا دیتا۔

ظاہر ہے کہ نجی ملکیت کا مسئلہ اسی قبیل سے ہے اس کو اگر جوں کا توں رہنے دیا جاتا ہے تو صنعت وارتقا کے اس دَور میں کوئی ایسی عملی اور سائنسی تدبیر سامنے نہیں آپاتی جو استحصال کو ختم کرسکے۔ اس بنا پر نجی ملکیت کے پرانے تصور میں تغیر لازم ہے۔ غلامی کی طرح اس پر غور کرتے وقت ہم پہلے بیع وشرا، ہبہ، وراثت، صدقات اور زکوٰۃ ایسے ابواب ومسائل سے نجی ملکیت کے جواز پر استدلال کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں بھی ہمیں حکیمانہ نقطۂ نظر سے کام لینا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان مسائل میں ایک تو ابواب واحکام کی موجودہ ترتیب ہے اور دوسرے ان کی وہ روح ہے، وہ علت وغایت ہے جو ان سب میں معنی ومقصد کی حیثیت سے جھلک رہی ہے۔ اگر وہ روح محفوظ ہے، تو نجی ملکیت کو قائم رہنا چاہیے۔ اگر وہ روح محفوظ نہیں ہے تو اس صورت میں ملکیت کے بارہ میں ایسا حل تلاش کرنا چاہیے جو اس روح کے عین مطابق ہو۔

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com